سزا

طاہر جاوید مُغل



سزا

طاہر جاوید مغل

کہتے ہیں کہ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے مگر ... یہ ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات انسان کی تدبیروں پر تقدیر ہنس رہی ہوتی ہے ایسی ہی ایک کوشش اس نے بھی کر ڈالی اور یہ بھول گیا کہ قدرت کے کچھ فیصلے اٹل ہوتے ہیں ..... ایسے میں اگر کوئی راہ نما مل جائے تو اسے خوش قسمتی کہتے ہیں ورنہ..... سرکشی سے تو ہمیشہ حادثات نے ہی جنم لیا ہے۔

خودداری کے زعم میں جیتے ایک [illegible] کا احوال

شوگران سے کاغان کی طرف جائیں تو دریا کے کنارے دائیں طرف دنیا کے خوبصورت ترین پہاڑی سلسلے میں روڈ سے قریباً سات میل آگے نہایت سرسبز پہاڑوں کے درمیان وہ ایک چھوٹا سا دوراہا تھا۔ چیڑ، دیودار اور چلغوزے کے بلند و بالا درختوں نے اس جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ پہاڑی ہوا جب ان درختوں کے درمیان سے تیزی کے ساتھ گزرتی تو سائیں سائیں کی دلکش آواز عجیب سا سماں باندھ دیتی۔ دائیں طرف ایک چشمے کے آثار تھے۔ اس نے اس جانی پہچانی فضا میں چند گہری سانسیں لیں اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

اس کا نام ستار احمد تھا۔

اس کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی۔ لمبی داڑھی بالکل سفید ہوچکی تھی۔ سر کے سفید بال بھی جٹاؤں کی صورت میں تھے۔ اس کے جسم پر ایک موٹی اونی گدڑی تھی۔ پاؤں میں چمڑے کی ایک "خودساختہ" چپل تھی جو شاید مسلسل سفر سے کٹ پھٹ چکی تھی اور نہ صرف یہ چپل بلکہ اس شخص کے پاؤں بھی خستہ حال تھے۔ اس نے دوراہے کو دھیان سے دیکھا۔ بائیں طرف والا راستہ ایک چھوٹے سے بنگلہ نما محکمۂ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس کی طرف جاتا تھا اور دائیں طرف

والا، اس کی محبوب بستی ''شادکوٹ'' کی طرف۔

پچھلے تقریباً پینتالیس برس میں وہ پہلی بار اس علاقے کی طرف آیا تھا اور وہ بھی شاید اس لیے کہ اب اسے یہ احساس تنگ کرنے لگا تھا کہ اب کسی بھی وقت ان پہاڑوں، وادیوں اور ان پتھریلے راستوں پر گھومتے گھومتے کسی بھی لمحے اس کی زندگی کی شام ہو جائے گی۔ پھر یا تو اس کا خاکی جسم کسی جنگل بیابان میں جنگلی جانوروں کی خوراک بن جائے گا یا پھر کچھ لوگ اس کی لاوارث لاش کو اٹھا کر کسی پہاڑی قبرستان میں دفن کر دیں گے...... یہی سوچیں اس کے قدموں کو بے ساختہ دریائے کنہار کی طرف کھینچ لائی تھیں۔ وہ یہاں آ گیا تھا لیکن جوں جوں وہ اس بستی کے قریب پہنچ رہا تھا، اسے یہی لگ رہا تھا جیسے اس نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ وہ اپنی محبوب بستی کو نہیں دیکھ سکے گا... اور اگر دیکھے گا تو پہلے سے زیادہ آزردہ اور دکھی ہو کر واپس لوٹے گا۔ اب وہ اس دوراہے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے معلوم تھا کہ ہوگا وہی جو پینتالیس برس پہلے ہوا تھا۔ حالات جو بھی ہوں، وقت نے چاہے کتنا کچھ بھی تبدیل کر دیا ہو مگر اس کے لیے کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔ ہاں...... اس کے لیے کچھ بھی نہیں بدلا ہوگا۔

اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے کپڑے کے جھولے میں سے کچھ بھنے ہوئے چاول نکال کر کھائے اور چشمے سے چند گھونٹ پانی پی کر پھر ایک ہموار پتھر پر بیٹھ گیا۔ ''شادکوٹ'' کی طرف جانے والے دو تین افراد اس کے سامنے سے گزرے، ایک جواں سال عورت بھی لکڑیوں سے لدے ہوئے خچر کو ہانکتی ہوئی شادکوٹ کی طرف گئی۔ ان سب افراد نے اسے ہموار پتھر پر بیٹھے ہوئے دیکھا لیکن کوئی بھی اسے پہچان نہیں پایا اور نہ ہی وہ کسی کو پہچان سکا تھا۔ یہ سارے افراد تقریباً نئی نسل کے تھے اور اگر پرانی نسل کے ہوتے تو بھی اس کا حلیہ اتنا تبدیل ہو چکا تھا کہ وہ اسے پہچاننے سے قاصر رہتے۔

سابر کی نظر اچانک چیڑ کے چھوٹے چھوٹے چند پودوں پر پڑی۔ پودوں کے درمیان اسے لوہے کا ایک پرانا بورڈ نظر آیا۔ تقریباً ایک فٹ مربع کے اس بورڈ پر کچھ لکھا تھا۔ دور سے سابر بس شادکوٹ کے الفاظ ہی پڑھ سکا۔ یہ بورڈ بائیں طرف جانے والے راستے پر لگایا گیا تھا۔ غالباً راہگیروں کو بتایا گیا تھا کہ شادکوٹ جانے والا راستہ اس طرف ہے۔ سابر نے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے رومال سے آنکھوں میں بھر آنے والی نمی صاف کی اور ذرا غور سے اس بورڈ کو دیکھا۔ خستہ حال بورڈ پر لکھا تھا ''شادکوٹ کا کھنڈر'' اس کا جسم سرتاپا سنسنا گیا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا بورڈ کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اس نے اپنی آنکھوں کو سکوڑا اور زیادہ دھیان سے دیکھا۔ لکھا تھا ''شادکوٹ کا راستہ'' نیچے تیر کا نشان بھی بنایا گیا تھا جو زنگ کی وجہ سے واضح نظر نہیں آتا تھا۔

وہ کچھ دیر بورڈ کو دیکھتا رہا، پھر واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ تب دوبارہ اس کی نگاہ بورڈ پر پڑی۔ ایک بار پھر جسم میں سنسناہٹ کی لہر دوڑی۔ بورڈ پر لکھا نظر آ رہا تھا ''شادکوٹ کا کھنڈر''

وہ پھر اپنی لاٹھی پر زور دے کر اٹھا۔ بورڈ کی طرف گیا۔ آٹھ دس قدم چلنے کے بعد تحریر صاف نظر آنے لگی۔ ''شادکوٹ کا راستہ''

''اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بوڑھے لرزاں جسم نے دیوار کے ایک تختے کا سہارا لیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو نکلے اور اس کے چہرے کی جھریوں میں گم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس اسی ہموار پتھر پر آ بیٹھا۔ بورڈ کی خستہ حالی الفاظ کو گڈمڈ کر رہی تھی مگر یہ صرف بورڈ کی یا الفاظ کی خستہ حالی نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک کہانی تھی، اندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک عجیب کہانی۔ سابر لاٹھی کے سہارے پتھر پر بیٹھا رہا۔ اس کا سر اپنے گھٹنوں کی طرف جھکا رہا۔ اس کے پردۂ تصور پر برسوں پہلے کے مناظر حرکت کرنے لگے۔

وہ بستی کے سردار ولی محمد کا بیٹا تھا۔ سردار کو یہاں ملک کہا جاتا تھا اور ملک ولی محمد علاقے کا سب سے بااثر اور قابلِ عزت شخص تھا۔ نہ صرف پورے تین پہاڑ اس کی ملکیت تھے بلکہ اس کے مویشیوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ تھی۔ سابر اپنے باپ کی واحد نرینہ اولاد تھا۔ لہٰذا شادکوٹ کا بلاشرکتِ غیرے مالک بھی وہی تھا۔ اس نے آٹھویں جماعت ایک مقامی اسکول سے پاس کی تھی۔ میٹرک تک اس نے گھر میں پڑھا تھا۔ اب ملک ولی محمد اسے مزید پڑھائی کے لیے شہر بھیجنا چاہتا تھا کیونکہ ولی محمد کو بہت شوق تھا کہ اس کا بیٹا شہر میں تعلیم حاصل کرے۔ سابر کو نہ چاہنے کے باوجود اب شہر جانا پڑ رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر بھاری بوجھ تھا۔ زندگی میں دو چیزیں ہی تو تھیں جن سے سابر نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ ایک شادکوٹ اور ایک تاجور...... تاجور بستی ہی کے ایک زمیندار کی بیٹی تھی۔ سابر کے گھرانے کے ساتھ ان کی دور کی

رشتے داری بھی تھی۔ اب اگر سابر پڑھنے کے لیے شہر جاتا تو اسے اپنی دونوں محبوب ترین چیزوں سے دور ہونا پڑتا۔ یعنی شادکوٹ اور تاجور۔

بستی سے باہر ڈھلوان پر اوپر کی طرف ایک جگہ تھی جسے ''چھجا'' کہا جاتا تھا۔ یہاں چیڑ، چلغوزے اور خوبانی کے بہت سے چھوٹے بڑے درخت تھے۔ یہاں سے نشیب میں شادکوٹ اور شادکوٹ کی چھوٹی سی بارانی جھیل کا منظر بہت پیارا لگتا تھا۔ سابر اور تاجور یہیں دو پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تاجور اپنی چھوٹی سی سفید بکری کو ڈھونڈنے کے بہانے یہاں آئی تھی۔ یوں انہیں تنہائی کے چند لمحے مل گئے تھے۔ تاجور نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا۔ ''شہر کی تو ہوا ہی اور ہوتی ہے۔ سارے کہتے ہیں تم وہاں جا کر بدل جاؤ گے۔ میری خالہ کی بیٹی لالہ کہتی ہے شہر کی لڑکیاں بڑی ہوشیار ہوتی ہیں۔ بندے کی مت مار دیتی ہیں۔''

''لیکن میری مت تو پہلے ہی مری ہوئی ہے۔'' سابر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

سابر نے ایک لمبی سانس لی۔ درختوں، پھولوں اور چشموں سے چھو کر آنے والی ہوا اس کے سینے میں داخل ہوئی اور اس کے دل کو عجیب گداز سے بھر گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوتی چلی گئی۔ اس نے عجیب نظروں سے نیچے اپنی خوبصورت بستی کو دیکھا، پھر اس نے سر گھمایا اور اس کی نگاہ حرکت کرتی ہوئی تاجور کے چہرے پر آ گئی۔ وہ بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تاج! میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں نے اپنی زندگی میں بس دو ہی چیزوں سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ ایک تم، اور ایک شادکوٹ۔ میں تم دونوں کو نہیں بھلا سکتا۔ چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گا۔''

اور سابر نے جو کہا تھا وہ سچ کر کے دکھایا۔ وہ سال تک وہ بالاکوٹ میں پڑھتا رہا، لیکن اس طرح کہ اس کی ایک ٹانگ بالاکوٹ اور دوسری اپنی بستی میں ہوتی تھی۔ ہفتہ وار چھٹی میں تو وہ گاؤں پہنچتا ہی تھا، ویسے بھی جب اور جہاں تھوڑا سا وقت ملتا تھا وہ مقناطیس کی طرح اپنے شادکوٹ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی آسان سفر نہیں تھا۔ پختہ سڑک سے آگے اسے پانچ چھ میل تک خچر پر یا پیادہ سفر کرنا پڑتا تھا...... کیونکہ راستے بے حد دشوار تھے۔

ایف اے کے فوراً بعد سابر نے والدین کو بتا دیا کہ وہ اب گاؤں میں رہے گا اور زمینداری کے کام میں ہاتھ بٹائے

گا۔ یہ نہیں تھا کہ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا، وہ ایک اوسط درجے کا بلکہ درجے کا اوسط سے بہتر طالب علم تھا لیکن جن دو چیزوں سے اسے بے تحاشا پیار تھا ان کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ وہ کہیں اور نہیں جاسکتا تھا۔

لہٰذا وہ شادکوٹ واپس آگیا۔ اب ایک بار پھر شادکوٹ کے نشیب و فراز تھے، شادکوٹ کی جانی پہچانی گلیاں تھیں، بھولی تھے۔ شادکوٹ کی چاندنی راتیں، سنہری دوپہریں اور اوس میں بھیگی ہوئی شامیں، سب کچھ اس کے پاس تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شادکوٹ کی وہ مخصوص مہک بھی تھی جو صرف شادکوٹ کا خاصہ تھی۔ یہ خوشبو بچپن سے ساہر کے دل و دماغ میں جاگزیں تھی۔ دوپہر کے وقت یہ خوشبو کچھ اور بھی مہک اٹھتی تھی۔ وہ آج تک تعین نہیں کرپایا تھا کہ یہ کیسی خوشبو ہے؟ شاید جب سورج کی تیز کرنیں خودرو نباتات پر پڑتی تھیں تو یہ خوشبو پیدا ہوتی تھی یا پھر جب سامنے والے پہاڑ سے گرنے والا آبشار پتھروں پر گرتا اور پانی کے چھینٹے اردگرد کی خوشبودار گھاس اور پودینے کے پتوں پر گرتے تھے تو یہ خوشبو اٹھا آتی تھی یا پھر ترائی میں سیب اور خوبانی کے باغوں سے گزرنے والی ہوا، خودرو پھولوں کو چھوکر اور مویشیوں کی حیوانی باس سے لپٹ کر اس خوشبو کی تشکیل کرتی تھی یا پھر..... ہاں وہ اب تک کچھ سمجھ نہ پایا تھا لیکن یہ خوشبو اس کو اتنی ہی عزیز تھی جتنی تاجور کی زلفوں سے اٹھنے والی مہک۔ اب بالاکوٹ سے لوٹنے کے بعد یہ دونوں خوشبوئیں پھر سے مستقل طور پر اس کے پاس تھیں اور وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔

وہ جب باپ کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہوا تو باپ کا بوجھ بھی ہلکا ہوگیا۔ ان کی زمینیں زیادہ فصل دینے لگیں، ان کے مویشیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ساہر اب بائیس سال کی عمر کو پہنچ رہا تھا۔ ان علاقوں میں لڑکوں کی شادی کے لیے یہ عمر بالکل ٹھیک سمجھی جاتی ہے۔ تاجور اس سے ڈھائی تین سال چھوٹی تھی، تاہم وہ بھی بھرپور جوان تھی۔ شباب اس پر ٹوٹ کر برسا تھا۔ ذرا دھوپ میں کھڑی ہوتی تو لگتا جیسے رخساروں سے لہو ٹپک پڑے گا۔ اس کی چال میں ندیوں کا سا لہراؤ، آواز میں جھرنوں جیسی گنگناہٹ اور آنکھوں میں دھنک کے رنگ سمائے رہتے تھے..... اب اس کے والدین کو بھی اس کی شادی کی فکر تھی۔ دونوں گھرانوں میں اچھے تعلقات بھی تھے۔ دونوں گھرانوں کے افراد کے ذہنوں میں یہ بات موجود تھی کہ ساہر اور تاجور کی شادی ہونی ہے، لیکن ابھی تک کوئی باقاعدہ عہد و پیماں نہیں ہوا تھا۔

ایک دن تاجور اپنی دو ہمراز سہیلیوں کے ساتھ چشمے کی طرف گئی۔ وہ وہاں سے پودینے کی تازہ پتیاں توڑنے کے لیے گئی تھیں۔ ساہر بھی وہاں پہنچ گیا۔ یوں انہیں تنہائی میں چند باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ دونوں چشمے کے نیچے چیڑ اور چلغوزے کے پیڑوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ نشیب میں بستی اور بستی کی خوبصورت جھیل نظر آتی تھی، اس جھیل سے کچھ فاصلے پر بالکل ایسی ہی ایک اور جھیل بھی تھی۔ ان دونوں جھیلوں کو ”جوڑا پانی“ کہا جاتا تھا۔ چشمہ ان کے عین اوپر تھا۔ جس جگہ کو چشمہ کہا جاتا تھا وہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان تھی بلکہ اسے ایک چھوٹی پہاڑی ہی سمجھنا چاہیے۔ ”یہ چٹان یا پہاڑی“ ڈھلوان پر عجیب خطرناک انداز سے جھکی ہوئی تھی۔ اس کا زیادہ تر حصہ ہوا میں معلق تھا، بس جڑ کی طرف سے پانچ چھ سو مربع فٹ کا ٹکڑا زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت کسی زمینی تبدیلی یا طوفان وغیرہ کی وجہ سے یہ عظیم الشان چٹان اپنی جگہ سے حرکت میں آجائے گی اور لڑھکتی ہوئی نشیب کی طرف روانہ ہوجائے گی۔ اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہوجاتا تو اس چٹان کے راستے میں سب سے پہلے آنے والی شے ”شادکوٹ“ کی خوبصورت بستی ہی تھی لیکن یہ چٹان نہ جانے کب سے اسی طرح جمی ہوئی کھڑی تھی۔ بدلتے ہوئے موسموں اور زمانوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اس دن چشمے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر ساہر اور تاجور نے وہی باتیں کیں جو نوجوان جوڑے ایسے موقعوں پر کیا کرتے ہیں۔ تاجور نے کہا۔ ”ساہر! مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اگر بابا نے کسی وجہ سے انکار کردیا تو کیا ہوگا؟“

”کوئی وجہ ہوگی تو انکار کریں گے ناں۔ مجھ جیسا شاندار داماد انہیں پورے علاقے میں ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔“ ساہر نے اپنے براؤن ریشمی بالوں کو پیشانی پر جماتے ہوئے کہا۔

”اتنا اترانے کی ضرورت نہیں ملک زادہ صاحب۔ برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔“ اس نے نظریں جھکا کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”اگر خدانخواستہ..... خدانخواستہ کوئی ایسا برا وقت آگیا تو کیا کروگی؟“ ساہر کا انداز لطف لینے والا تھا۔

”سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی جاؤں گی..... ہمیشہ کے لیے..... دور کہیں کسی اللہ والے کے مزار کی خادمہ بن کر زندگی گزار دوں گی۔“

”لیکن میں کیا کروں گا؟ تمہیں تو پتا ہے، میں اپنی اس

بستی کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“ ساہر نے سوال اٹھایا پھر کچھ دیر بعد خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”میں ایسا کروں گا کہ کسی مزار پر جانے کے بجائے خود اپنا مزار بنوالوں گا۔ پہاڑ سے کود کر جان دے دوں گا اور وصیت کرجاؤں گا کہ میری قبر قبرستان میں جھیل کے کنارے کی طرف بنائی جائے۔ تمہارا کام بھی بن جائے گا۔ کسی اور کے مزار کی خادمہ بننے کے بجائے تم میری ہی قبر کی متولی بن جانا، اور اگر.....“

ساہر کی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی کیونکہ تاجور اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ اس نے ساہر کو سر کے بالوں سے پکڑلیا اور اسے جھنجوڑنے لگی۔ ”ساہر..... ساہر! میں تمہارا گلا دبادوں گی۔ کیوں شام کے وقت ایسی بدفالیں منہ سے نکالتے ہو؟“

وہ پشت کے بل گر گیا۔ وہ اس سے دھینگا مشتی کرنے لگی۔ شاید ساہر بھی یہی چاہتا تھا۔ تاجور کے جوان جسم میں قیامت کا لمس تھا۔ اس کی کمر کی لچک، اس کے بالوں کا لہراؤ، اس کے ہاتھوں کی بجلیاں۔ بس وہ چند لمحے ہی تھے لیکن ایسے چند لمحے بھی ساہر کو سرشار کردیا کرتے تھے۔

اسی دوران میں نشیب سے تاجور کی خالہ زاد لڑکی کی آواز آئی۔ ”تاجور“

اس آواز کا مطلب تھا کہ کوئی آرہا ہے اس لیے وہ سنبھل کر بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر چلے گئے۔ تاجور پودینے کی پتیاں چننے لگی۔ ساہر ایک پتھر کی اوٹ میں ہوگیا۔ بستی کا عمر رسیدہ چرواہا عبداللہ اپنی گائیوں کو ہانکتا اور لڑکیوں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا آگے نکل گیا۔

ساہر جس جگہ کھڑا تھا وہ چشمے کے بالکل نیچے تھی۔ یہاں سے دیوہیکل چٹان کا وہ حصہ صاف نظر آتا تھا جو زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ اکثر اوقات بستی والوں کی نگاہ چٹان کے اس حصے پر پڑتی ہی رہتی تھی۔ پچھلے دو برسوں کی موسلا دھار بارشوں کے بعد چٹان کے نیچے کی بہت سی سرخی مائل مٹی بہہ گئی تھی جس کی وجہ سے چٹان کا زمین میں دبا ہوا حصہ نظر آنے لگا تھا۔ سب سے پہلے مٹی کے اس بہاؤ کی اطلاع بھی چرواہوں نے ہی دی تھی، جس میں بستی کا سب سے بزرگ چرواہا عبداللہ بھی شامل تھا۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بستی کے اکثر لوگ مٹی کے اس بہاؤ کی باتیں کرنے لگے تھے۔

ساہر زمین کے اندر سے نمودار ہونے والے چٹانی حصے کو غور سے دیکھ رہا تھا جب تاجور بھی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے ساہر سے کہا۔ تھوڑی دیر پہلے کی دھینگا مشتی کے سبب اس کے عارض ابھی تک سرخ تھے۔

”کچھ نہیں“ ساہر نے جواب دیا۔ ”ویسے ہی سوچ رہا ہوں۔ پتا نہیں یہ کتنے لاکھ ٹن وزنی پتھر ہے جو ہمارے سروں پر کھڑا ہے۔“

”ساہر اگر یہ کسی وقت گر جائے تو کیا ہو۔ ہمارا گاؤں تو خدانخواستہ ملیامیٹ ہوجائے گا۔“

”دیکھو اب تم بدفالیں منہ سے نکال رہی ہو اور خیر سے یہ شام ہی کا وقت ہے۔“

”تم نے خود ہی تو بات چھیڑی تھی۔“

”نہیں تاج! ہمارے شادکوٹ کو کچھ نہیں ہوسکتا۔“ ساہر نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اس پر خدا کی رحمتوں کا سایہ ہے۔ یہاں محبتیں ہیں، یہاں عبادتیں ہیں، یہاں جفاکش لوگ ہیں اور ان کی انسانیت ہے۔ اتنے پیارے لوگوں کی اتنی پیاری بستی کو برباد کرنے سے پہلے تو قدرت بھی ہزار بار سوچے گی۔ یہ چٹان اس جگہ کوئی ہوئی ہے تو یہ کوئی دس بیس سال کی ہی بات نہیں ہے۔ اس کو نہ جانے کتنے زمانے گزر چکے ہیں اور ابھی نہ جانے کتنے زمانوں تک اسے اسی طرح کھڑے رہنا ہے۔ پتا ہے تمہارے دادا خدا بخش کیا کہا کرتے تھے؟“

تاجور نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔

”ان کے بچپن میں ایک دفعہ اسی طرح سخت موسموں کی وجہ سے چشمے کے نیچے سے کچھ زمین کھسک گئی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ چشمہ خطرناک ہوگیا ہے۔ اس وقت انگریز کی حکومت تھی۔ بہت سے بڑے بڑے افسر جیپوں اور گھوڑوں پر سوار ہوکر یہاں تک پہنچے تھے۔ انہوں نے کئی دن تک چشمے کا معائنہ کرکے کہا تھا کہ یہ چٹان بالکل ٹھیک ہے۔ اگلے ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک اس کو کچھ نہیں ہونے والا۔“

”لیکن ساہر! ایسی صورتِ حال میں یقین سے تو کوئی بات نہیں کی جاسکتی ناں۔ اگر کہا جائے کہ فلاں بندہ بیس سال سے بیمار ہے لیکن وہ نہیں مرا اس لیے وہ آئندہ بھی نہیں مرے گا..... تو یہ غلط ہوگا۔ جس کام میں خطرہ ہو وہ خطرہ کبھی نہ کبھی تو سامنے آتا ہی ہے۔“

ساہر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے ذرا شوخ سے لہجے میں کہا تھا۔ ”جب تم ایسی باتیں کرتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ ہمارے بچے بڑے ہوکر ضرور وکیل بنیں گے۔“

اس کی بات پر وہ ایک بار پھر سرخ ہوگئی۔ اس بار یہ سرخی شرم کی وجہ سے تھی اور شرم اتنی زیادہ تھی کہ وہ ساہر کے سامنے مزید ٹھہر نہیں سکی۔ اسے گھور کر وہ تیزی سے واپس

مڑ گئی۔ سنابر کی مسکراتی نظر دیر تک اس کی بل کھاتی کمر اور لہراتی چوٹی کا جائزہ لیتی رہی۔

☆☆☆

سنابر کی خوش بختی نے زندگی میں اکثر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب شادی والے معاملے میں بھی تھوڑی بہت اڑچن تو تھی لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ شادکوٹ کے اکلوتے وارث کا رشتہ بھلا کوئی کیسے رد کر سکتا تھا۔ مقامی رواج کے مطابق تاجور اور سنابر کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ علاقے کے کئی بڑے زمینداروں اور ملکوں نے اس شادی میں شرکت کی۔ ملک ولی محمد نے اس تقریب پر دل کھول کر پیسا خرچ کیا اور خوشی کے اس موقعے پر علاقے کے غریب غربا کو بھی پوری طرح یاد رکھا۔ ولی محمد ایک نیک سیرت اور عبادت گزار شخص تھا۔

شادی کے بعد سنابر اور تاجور کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات کے مانند تھی۔ ایک طرح سے وہ بستی کا خوبصورت ترین جوڑا تھا۔ وہ جدھر سے گزرتے لوگوں کی نگاہیں الجھی رہ جاتیں۔ یوں لگتا جیسے سنابر واقعی اپنی خوش بختی اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں جو چاہا حاصل کیا، جس طرف بھی قدم اٹھائے دیواروں نے اسے راستے دیے۔ سنابر کی شادی کی طرح سے مبارک ثابت ہوئی تھی۔ اس شادی سے نہ صرف سنابر کی زمینوں اور اس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا بلکہ اردگرد کے علاقے میں ملک ولی محمد کی جو ایک دو چھوٹی موٹی دشمنیاں تھیں وہ بھی دوستی میں بدل گئیں۔

لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ خوشیوں کے سمندر میں دکھوں..... اور دکھوں کے سمندر میں خوشیوں کے جزیرے ضرور ملتے ہیں، سنابر کی زندگی میں بھی دکھ کا ایک جزیرہ اس وقت آیا جب اس کے والد ملک ولی محمد ایک مختصر علالت کے بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

اس واقعے کے بعد سنابر چند ہفتے تو سخت صدمے سے دوچار رہا، پھر تاجور کی بے پناہ محبت اور توجہ نے اسے معمول کی زندگی کی طرف واپس بلا لیا۔ اب اس پر ذمے داریاں پہلے سے بہت بڑھ گئی تھیں۔ وہ 23 سال کی عمر میں ہی شادکوٹ کے سیاہ سفید کا مالک بن گیا تھا۔ اگرچہ شادکوٹ کی ذمے داریاں بہت بھاری تھیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس کی محبوب بستی تھی اور محبوب کی ذمہ داری کا تو کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ جیسے وہ تنہائی کے حسین لمحوں میں جب بھی تاجور کے پُرشباب جسم کو اپنے بازوؤں میں بھرتا تو وہ اسے گلاب کی طرح ہلکی پھلکی لگتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے اپنی محبوب بستی اور اپنی محبوب بیوی میں بے شمار مشابہتیں نظر آنے لگتی تھیں۔ وہ بستی کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کا دیوانہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بستی کے ہر ہر کوچے میں پوری رفتار سے دوڑ سکتا تھا۔ وہ اپنے شادکوٹ کو اس کے لمس اور اس کی خوشبوؤں سے شناخت کر سکتا تھا۔ وہ بستی کے ہر ہر پیڑ، پتھر اور چشمے کو علیحدہ علیحدہ پہچانتا تھا اور بستی کا ہر موسم اس کے دل کا موسم بن جاتا تھا..... تاجور کے معاملے میں بھی سب کچھ ایسا ہی تھا۔

سنابر جس طرح اپنی بستی سے زیادہ دیر تک دور نہیں رہ سکتا تھا، اسی طرح اپنی تاجور سے بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر کسی وقت اسے کسی کام سے بالاکوٹ یا مانسہرہ تک جانا بھی پڑتا تو مقناطیس کی طرح واپس کھنچا چلا آتا۔ تاجور کے لیے بھی اس کی جدائی کا وقت کاٹنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ ان کی شادی کو اب ایک سال ہونے کو آیا تھا لیکن وہ ایک دوسرے کے لیے پہلے دن جیسی ہی بے تابی محسوس کرتے تھے۔ وہ ایک دن کے بعد بھی ملتے تو یوں لگتا جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ تنہائی ملتے ہی سنابر اپنی محبوب بیوی پر محبت کی بارش کر دیتا اور وہ بھی اس کے پیار میں ڈوب ڈوب جاتی۔ اس ملاپ نے ایک دوسرے کے لیے ان کی محبت کو کم نہیں کیا تھا بلکہ بڑھایا تھا۔

ہاں ان دنوں سنابر خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کرتا تھا۔ وہ ہر طرح سے آسودہ تھا، کون سی خوشی تھی جو اسے حاصل نہیں تھی..... اور پھر انہی دنوں میں وہ ٹھٹھری ہوئی رات آ گئی جس نے سنابر کی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یہ نومبر کا آغاز تھا۔ دور کے پہاڑوں پر پہلی برف باری ہو چکی تھی۔ ہڈیوں میں اتر جانے والی سردی دھیرے دھیرے نشیب و فراز پر پڑاؤ ڈال رہی تھی۔

سنابر کے خاص ملازم اوج خان نے دروازے پر دستک دی اور سنابر کو بتایا۔ "ملک جی! مہمان خانے میں ایک بابا جی آئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کہتے ہیں میں بڑے ملک صاحب کا دوست ہوں۔"

"اتنی رات گئے؟ ان سے کہو صبح آرام سے بات کریں گے۔"

"نہیں ملک جی، وہ ابھی ملنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا..... میں آتا ہوں۔ تم انہیں کھانے کا پوچھو۔"

"جو حکم جی۔" اوج خان نے کہا اور واپس چلا گیا۔

گرم کمرے اور "گرم بستر" سے جدا ہونا سنابر کو مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ بہرحال وہ صدری پہن کر اور دستار سر پر رکھ کر باہر جانے کو تیار ہو گیا۔ تاجور نے گرم شال اس کے کندھے پر ڈال دی۔ گھر سے باہر سرد ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ پچاس ساٹھ قدم چل کر وہ مہمان خانے میں پہنچا تو اوج خان نے بابا جی کے سامنے کھانا چن دیا تھا۔

بابا جی کی عمر پچھتر اسی سال رہی ہو گی۔ سخت سردی میں بھی ان کے جسم پر معمولی لباس تھا۔ سفید داڑھی سینے سے نیچے تک جاتی تھی۔ چہرے مہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے عرصے تک کھلے علاقوں میں موسموں کی سختیاں جھیلی ہیں۔ بابا جی نے خود کو سنابر کے والد مرحوم کا دوست بتایا تھا لیکن سنابر کو لگتا تھا کہ اس نے اس سے پہلے انہیں یہاں نہیں دیکھا تھا۔

اوج خان نے محترم بزرگ کے سامنے کھانا چن دیا تھا لیکن وہ اس پُرتکلف کھانے کے بجائے اپنے جھولے میں سے چنے نکال نکال کر کھا رہے تھے۔ وہ اپنے اردگرد سے بالکل بے پروا نظر آتے تھے۔ اپنی موٹی غلافی پلکیں اٹھا کر انہوں نے سنابر کو دیکھا اور پھر اوج خان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا انداز پہچان کر سنابر نے ملازم اوج خان کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اوج خان انگیٹھی کی آگ کو درست کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بزرگ نے اپنی متاثر کن اور نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ "سنابر! میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بات کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ میری بات بالکل صاف اور سیدھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات تمہاری مرضی کے خلاف ہو اور تمہیں اس کا ماننا بہت مشکل لگے لیکن تمہارے پاس اس کو ماننے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ میں تمہاری پیشانی پر جو کچھ لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں، وہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ مان لو گے تو بہت بڑی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے۔"

سنابر نے ایک گہری سانس لی۔ اسے خود ساختہ عاملوں اور پیروں فقیروں کا یہ دھمکی آمیز انداز کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا، جب وہ سادہ لوح لوگوں کو آنے والی آفات سے ڈراتے اور پھر کسی نہ کسی شکل میں مالی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ سامنے بیٹھے ہوئے بزرگ ایسے مطلب پرست پیروں فقیروں میں سے تو نہیں لگتے تھے تاہم بات وہ بھی دھمکانے والی ہی کر رہے تھے۔

"بابا جی! آپ کھل کر بتائیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ بغیر کسی تمہید کے بولے۔ "سنابر! میں جانتا ہوں، اس وقت راوی تمہارے لیے چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ تم بستی کے واحد وارث ہو۔ بستی کے اندر اور باہر سے تمہیں کسی طرح کا کوئی ڈر اندیشہ نہیں ہے۔ تمہارے لیے ہر طرف خوشی ہے اور من چاہی زندگی ہے..... لیکن میرے بچے! یہ قدرت کا دستور نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں بزرگوار؟"

"ہاں، تم واقعی نہیں سمجھ رہے اور میں تمہیں سمجھانے کے لیے ہی آیا ہوں۔ قدرت نے خوشی اور غم کو ساتھ ساتھ پیدا کیا ہے۔ آنسو اور ہنسی، بیماری اور صحت، جدائی اور ملاپ، سکون اور بے آرامی، سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ کے نیک بندوں کو دیر تک تکلیف نہیں آتی یا ان کی خوشیوں کے سلسلے طویل ہو جاتے ہیں تو وہ فکرمند ہو جاتے ہیں۔ ڈرنے لگتے ہیں کہ کہیں اوپر والا ان سے ناراض تو نہیں ہو گیا..... کہیں خوشی اور سکھ کے کھاتے میں کسی اگلے صفحے پر ان کے حساب میں کوئی بہت بڑا دکھ تو نہیں لکھا جانے والا۔"

"بزرگوار میں اب بھی کچھ سمجھ نہیں پایا۔"

"تم کچھ نہیں سمجھ پاؤ گے۔ کیونکہ تم ماننے کے بجائے دیکھنے پر زیادہ یقین رکھتے ہو، اور جو "ہے" اسے تم دیکھ نہیں پا رہے ہو..... لیکن..... میں دیکھ رہا ہوں۔ ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔" بابا جی کی "دور تک دیکھتی ہوئی سوئی سوئی نگاہیں" سنابر کی پیشانی پر مرکوز تھیں۔ ان کا انداز سنابر کو اندر سے ہلا رہا تھا۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔"

"میں ایسی کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا مگر ایسا ہو بھی سکتا ہے۔"

سنابر نے اپنے چہرے کے تاثرات تبدیل نہیں ہونے دیے مگر اندر سے وہ ایک بار پھر تھوڑا سا ہل گیا تھا۔ بابا جی کی انگلیاں بڑی خاموشی اور تواتر سے لکڑی کی تسبیح کے ادھڑے دانوں پر حرکت کرتی رہیں۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے اور پتھروں سے بنے ہوئے اس پکی چھت والے گھر سے باہر برفانی ہوا تیزی دکھا رہی تھی۔

کافی دیر بعد سنابر نے سر اٹھا کر بابا جی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں رد بلا کے لیے صدقہ خیرات وغیرہ کروں؟"

"وہ بھی اچھی بات ہے۔ مستحق لوگوں کو دیا ہوا صدقہ آفتوں کو ٹالتا ہے لیکن تمہارا معاملہ کچھ اور ہے۔ تمہیں کچھ اس سے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔" بزرگوار کا لہجہ اٹل تھا۔

"جی فرمائیے۔" سنابر نے اپنی اندرونی جھنجلاہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اپنی زندگی میں سے کچھ دینا پڑے گا۔"

"زندگی میں سے......؟" ساہر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تمہیں اپنا عیش و آرام ترک کرنا ہوگا۔ بیوی بچے...... یہ گھر...... یہ بستی...... تمہارا رنگ پھیکا کیوں پڑ گیا ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے نہیں، کچھ عرصے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ صرف دو سال کے لیے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں دو سال کے لیے سب کچھ چھوڑ کر کہیں نکل جاؤں؟"

"کہیں نہیں...... کہیں نہیں۔" بزرگ نے عجیب انداز میں سر ہلایا۔ "وہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ کہاں جانا ہے۔" ساہر خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر مراقبے کی سی کیفیت میں رہے...... پھر کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ "ساہر! یہ جو ویرانے ہوتے ہیں ناں ان کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت بندے کو خلقت سے دور اور خالق سے قریب لے آتی ہے۔ یہ جنگل بیلے، یہ ریگستان، یہ اجاڑ خانقاہیں، یہ الگ تھلگ پہاڑ، یہ سب بندے کو اپنی پہچان کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ سب راہ سلوک کے راستے ہیں۔"

"آپ کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہیں۔" ساہر اب اپنی بیزاری کو چھپا نہیں پا رہا تھا۔

"کچھ باتیں سمجھ کر مانی جاتی ہیں، کچھ باتیں پہلے ماننی پڑتی ہیں پھر سمجھ میں آتی ہیں۔ میں بھی اسی دوسری قسم کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا، آپ بتائیں۔ آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں......؟"

"تمہیں اپنی خوشیوں اور راحتوں کا خراج دینا ہوگا ساہر! تمہیں دو قمری سالوں کے لیے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ قمری سال سمجھتے ہو ناں تم؟ جو چاند کے حساب سے ہوتا ہے۔ دو قمری سالوں کے بعد تم اپنے شاد کوٹ میں واپس آجاؤ گے۔ اپنے بیوی بچوں کے پاس، اپنے لوگوں کے پاس۔ پھر تم دو سال یہاں رہو گے۔ اس کے بعد "کاتک" کی ایک ایسی ہی رات میں میں پھر آؤں گا...... تمہیں پھر میرے ساتھ جانا ہوگا لیکن اس مرتبہ تین سالوں کے لیے۔ تین سال بعد تم واپس لوٹو گے اور تین سال پھر اپنی بستی میں گزارو گے...... تب بشرط زندگی میری اور تمہاری ملاقات پھر ہوگی۔ اس مرتبہ تم چار سال کے لیے بستی سے اور اپنی دنیا سے دور رہو گے۔ اسی طرح ایک قمری سال کے اضافے سے یہ سلسلہ تمہاری زندگی میں چلتا رہے گا۔ جو کچھ میں تمہیں بتا رہا ہوں حرف بہ حرف اسی طرح ہے۔ اس میں کسی اضافے یا کمی کی گنجائش نہیں ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ تم کوئی ایسی بات کہو گے بھی نہیں......" بزرگ نے بات مکمل کی اور اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

ساہر حیرت سے اس عمر رسیدہ شخص کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کتنی قطعیت سے بات کر رہا ہے اور اتنی بڑی بات کر کے بھی اس کے چہرے پر کوئی تردد نہیں ہے۔ ایسی باتیں اور ایسے لہجے عموماً ساہر کو زچ کر دیا کرتے تھے۔ ایک عجیب جھنجلاہٹ اس کے اندر سر اٹھانے لگی۔ وہ بزرگ کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر میں آپ کی بات نہ مانوں تو......؟"

"تو میں چلا جاؤں گا۔"

"مجھے کسی بڑی آفت کے حوالے کر کے؟" ساہر کے لہجے میں طنز چھپا تھا۔

"میں حوالے کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ میں تو صرف وہ بتا رہا ہوں...... جو میرا علم اور تمہارا ماتھا مجھے دکھا رہا ہے۔"

ساہر نے اپنے اندرونی طیش کو بہ مشکل ضبط کیا اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میری گزارش ہے کہ آپ میرے غریب خانے کا کھانا تناول فرمائیں اور آرام کریں۔ صبح میرے ملازم آپ کے ساتھ جائیں گے اور آپ جہاں تک کہیں گے وہاں تک آپ کو چھوڑ آئیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم انکار کر رہے ہو؟"

"میں آپ کی ساری باتوں سے انکار نہیں کر رہا مگر جس درویشی اور جنگل گردی کی بات آپ کر رہے ہیں، وہ ماننا میرے لیے ممکن نہیں۔" اپنی اندرونی جھنجلاہٹ کے مقابلے میں ساہر نے نرم ترین الفاظ استعمال کیے تھے۔

ساہر اور بزرگ کی آنکھیں کچھ دیر تک ایک دوسرے سے الجھی رہیں پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "تو ٹھیک ہے۔ پھر میں چلتا ہوں۔"

"کیا مطلب...... اتنی رات گئے۔ ایسے موسم میں؟"

"رات دن اور موسم کا حساب کتاب تم جیسے لوگوں کے پاس ہوتا ہے ساہر۔"

بزرگ نے اپنا عصا اٹھایا اور اپنا جھولا درست کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"ایسی تیز ہوا میں آپ کو باہر نہیں جانا چاہیے۔ برف باری بھی شروع ہو سکتی ہے۔" ساہر نے چھوٹے چھوٹے شیشوں والی وزنی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ چیڑ اور سرو کے دراز قد پودے یخ بستہ ہوا میں جھوم رہے تھے۔

بزرگ نے بھی کھڑکی سے باہر دیکھا اور بدستور گمبھیر لہجے میں بولے۔ "جس بستی پر موت کا سایہ ہو وہاں زیادہ دیر رکنا بھی تو مناسب نہیں۔ موت ٹلی رہے تو مدتوں ٹلی رہے نہ ٹلے تو پل بھر کی مہلت نہ دے۔"

اس وقت ساہر نے دیکھا بزرگ کی نگاہیں کھڑکی سے پار چیڑ اور سرو کے درختوں سے آگے، دور بلندی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بلندی...... جہاں چھجے کی عظیم الشان چٹان، نامعلوم وقتوں سے بے حس وحرکت کھڑی تھی۔

وہ چند لمحوں کے لیے کانپ سا گیا لیکن پھر فوراً ہی اس کے اندر کی حقیقت پسندی اور Rational Approach اس پر غالب آگئی۔ وہ اپنے اندر کی تپش کو چھپا نہیں سکا۔ وہ بزرگ کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس طرح کی رمزیہ باتیں اچھی نہیں لگتیں اور نہ ہی اشارے کنائے پسند ہیں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو، مجھ میں سننے کا حوصلہ ہے۔ بتاؤ کیا آفت برپا ہونے والی ہے میرے ساتھ۔"

بزرگ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ کچھ دیر تک ساہر کے تاثرات دیکھتے رہے پھر ہولے سے بولے۔ "مجھے جانے دو، یہی میرے اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

"لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے دل میں کیا ہے اور تم نے میرے ماتھے پر کیا پڑھ لیا ہے جو مجھے آنے والے وقت سے ڈرا رہے ہو۔"

"میں تمہارے لیے معافی کا راستہ بند کرنا نہیں چاہتا اور نہ تمہاری معصیت کو اور سخت کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر وہی رمزیہ باتیں۔ مجھے چڑ ہے ان باتوں سے، اپنے دل کی بات صاف صاف کیوں نہیں بتاتے اور اگر تمہاری غیب دانی تمہیں اس تجھے کے بارے میں کچھ بتا رہی ہے تو اس طرح کی غیب دانیاں اس سے پہلے بھی بہت ہو چکی ہیں۔ میرے دادا اور پھر ان کے دادا کے زمانے میں بھی تمہارے جیسے "پہنچے ہوئے لوگوں" نے یہاں کے لوگوں کو جی بھر کر ڈرایا ہے اور فائدہ بھی اٹھایا ہے۔"

بزرگ اب تک شاید ضبط سے کام لے رہے تھے لیکن ساہر کے لہجے کی بڑھتی ہوئی گستاخی نے ان کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری کر دیا۔ ان کے ہونٹ مضبوطی سے آپس میں بھنچ گئے۔ وہ کچھ دیر تک ساہر کا چہرہ تکتے رہے پھر بولے۔ "میں کل تک تمہیں بتا دوں گا۔ تم بھی کل تک سوچ لو۔"

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں بھی جاؤں، لیکن کل سورج ڈوبنے تک تمہیں بتا دوں گا۔"

وہ عجیب درویشانہ چال چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ساہر نے انہیں پھر روکنا چاہا لیکن اسے اس میں سبکی محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا کہ اتنی رات گئے اتنی سردی میں اس کے گھر سے نکل جانا بھی، دراصل اس شخص کے دھمکانے کا ایک انداز ہے۔ جانے کیوں وہ کیوں ہمیشہ سے ایسے لوگوں اور ایسے رویوں سے الرجک تھا۔ اس نے اسے جانے دیا۔ پھر بڑبڑاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ جاتے جاتے اس نے بلند آواز میں اوج خاں کو مہمان خانہ بند کرنے کا کہا۔ یہ بھی ایک طرح سے اس کا اظہار طیش تھا۔

اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا تاجور پریشانی کے عالم میں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

☆☆☆

اگلے روز ساہر کو کئی کام کرنے تھے۔ والدہ کو کھانے ایک ڈاکٹر کے پاس بھی جانا تھا، ایک پنچایت میں شرکت کرنا تھی، پھر کھیت مزدوروں کو ہفتہ وار مزدوری دینا تھی۔ تاہم اس ساری مصروفیت کے دوران میں بھی رات والے عمر رسیدہ شخص اور اس کی پریشان کن گفتگو کا خیال گاہے بگاہے اس کے ذہن میں آتا رہا۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی جب ساہر کا ایک نوجوان مزارع ایک کاغذ لے کر ساہر کے پاس پہنچا۔ اس نے بتایا کہ ایک راہگیر جس کا چہرہ گرم چادر سے ڈھکا ہوا تھا یہ رقعہ اس کے لیے دے گیا ہے۔

ساہر نے تہہ کیا ہوا کاغذ کھولا۔ اس پر صرف چند سطریں لکھی تھیں۔

"مجھے غیب کا علم نہیں لیکن میرے خدا نے مجھے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ میں پیشانیاں پڑھ سکتا ہوں اور اپنے وجدان کی مدد سے آنے والے وقت کے بارے میں اندازہ لگا سکتا ہوں...... کل رات والی گفتگو میں تم نے خود کو درپیش خطرے کا درست قیافہ لگایا ہے۔ جو پتھر ایک مدت سے تمہاری بستی کے اوپر ٹھہرا ہوا ہے وہ اب زیادہ دیر ٹھہرنے والا نہیں ہے۔ یہ بہت جلد گرے گا اور تم اپنی بستی کو کھنڈر دیکھو گے۔ یہاں کچھ نہیں بچے گا تمہارے لیے...... سب کچھ برباد ہو جائے گا اور تم اپنی بستی کو کھنڈر کی صورت دیکھو گے۔ یہاں کچھ نہیں بچے گا تمہارے لیے...... سب کچھ برباد ہو جائے گا۔

"میں کوئی بددعا نہیں دے رہا، اپنا بدترین اندیشہ تم سے بیان کر رہا ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو...... مگر تم اب بھی اپنے فیصلے پر نظرثانی کر لو۔"

"یاد رکھو، ہم حادثوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن

وہ اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ مدتوں کسی انسانی غلطی، کسی اتفاق یا قدرتی آفت کی شکل میں گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے نہ ملنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ناپید ہوگئے ہیں۔ خدا حافظ!''

سابر نے، سیاہ روشنائی اور سرکنڈے کے قلم سے لکھی ہوئی، یہ سطور کئی بار پڑھیں اور ہر مرتبہ اس پر عجیب سی طیش آمیز جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ وہ روحانیت سے انکاری نہیں تھا، لیکن روحانیت کو کسی نشے کی طرح خود پر سوار کرلینا بھی اسے پسند نہیں تھا۔ روحانی موشگافیاں، ماورائی حکایتیں اور مستقبل بینی وغیرہ کی پھلجڑیاں، اسے ہمیشہ سے زچ کرتی تھیں جس سے بسا اوقات وہ جھنجلا جاتا تھا۔ زندگی کے بارے میں اس کا اپنا ایک ٹھوس نظریہ تھا، جو حقیقت اور دلیل کی زمین سے توانائی حاصل کرتا تھا۔ اپنے والد گرامی سے سابر کو بہت محبت تھی اور دونوں کے خیالات اکثر آپس میں ملتے تھے تاہم روحانی نظریات کے حوالے سے سابر کو اپنے والد سے بھی اختلاف تھا۔

اپنے مزارع کے ہاتھوں موصول ہونے والی سطور، سابر نے کئی بار پڑھیں اور پھر پھاڑ کر پھینک دیں لیکن کاغذ کے پھٹنے سے تحریر تو اوجھل ہوجاتی ہے، اس کا اثر تو نہیں ہوتا۔ پھٹے ہوئے کاغذ پر لکھے ہوئے وہ الفاظ کئی ہفتے گزر جانے کے باوجود سابر کے دل و دماغ میں موجود رہے۔ یہ الفاظ اپنے اندر چھپے ہوئے تمام اندیشوں سمیت اکثر سابر کے آس پاس موجود رہتے تھے۔ شادکوٹ کی نیلی جھیل کے کنارے گھوڑا دوڑاتے ہوئے، شادکوٹ کی سرسبز ڈھلوانوں پر دھوپ سینکتے ہوئے یا پھر بستی کے محبوب گلی کوچوں میں اپنے محبوب چہروں کے درمیان گھومتے پھرتے وہ اکثر چونک جاتا۔ اس کی نگاہ آپوں آپ دور اوپر اس سیاہی مائل چٹان کی طرف اٹھ جاتی، جسے یہاں چھجے کا نام دیا جاتا تھا۔ اس بے حرکت چھجے کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا خوف اس کے دل و دماغ میں پنپنے لگتا تھا اور اس کے ساتھ ہی سفید ریش بزرگ کا چہرہ اس کے تصور میں گھوم جاتا۔

کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی ہوتی جب وہ تاجور کے قریب ہوتا۔ ریشمی راتوں کی تنہائی میں جب کمرے سے باہر سرد ہوائیں چنگھاڑتیں اور کمرے کے اندر آتشدان کی خوشگوار حرارت میں تاجور کا چہرہ دہکتا اور اس کی خوشبودار زلفیں سابر کے چہرے کو ڈھانپتیں تو سفید ریش بزرگ کے الفاظ برفیلے پانی کی دھار کی طرح اس کے کانوں میں داخل ہونے لگتے۔ وہ ان الفاظ کی طرف سے دھیان ہٹانے کی بہت کوشش کرتا، خود کو تاجور کے پُرحرارت گداز میں ڈبو دیتا لیکن برفیلے پانی کی بوندیں مسلسل اس کے کانوں میں گرتی رہتیں۔ سب کچھ برباد ہوجائے گا...... سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ یہ پتھر...... اب زیادہ دیر تک اپنی جگہ رکا نہیں رہے گا۔

مخملی بستر پر مچلتی جسم والی تاجور اسے اپنی تمام تر مقناطیسیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتی۔ ''کہاں کھو گئے ہو؟''

''کہیں نہیں۔'' وہ کہتا اور پھر سے زلفوں کے ریشم میں پناہ لے لیتا۔

ایک دن وہ اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ہمراہ چھجے کے خصوصی معائنے کے لیے گیا۔ ان ساتھیوں میں اس کا ایک پرانا دوست ظفر عباسی بھی تھا جو ایبٹ آباد کا رہائشی تھا۔ ظفر عباسی نے انجینئرنگ کی تھی، اب وہ سڑکوں کی تعمیر کے شعبے سے منسلک تھا۔ سابر نے ظفر عباسی کو خصوصی طور پر چھجے کا معائنہ کرانے کے لیے بلوایا تھا۔ وہ ظفر ایک دو دفعہ پہلے بھی اس عظیم الجثہ چٹان کو دیکھ چکا تھا، تاہم تب تک حالیہ طوفانی بارشوں نے چھجے کے نیچے کی مٹی کو اتنا زیادہ نہیں ہٹایا تھا۔

چھجے کے نیچے نظر آنے والے تازہ خلا نے ظفر کو بھی چونکا دیا تھا۔ اس نے قریب سے اور دور سے چھجے کی کئی تصویریں کھینچنے کے بعد۔ ''مجھے مٹی کے چند ایک نمونے بھی درکار ہوں گے۔''

''ان کا کیا کرو گے؟''

''اسلام آباد کی لیبارٹری سے چیک کرواؤں گا، اور ممکن ہوا تو اپنے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو بھی یہاں کا ایک وزٹ بھی کراؤں گا۔ اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے......''

کوئی ایک ماہ بعد سابر کی یاد دہانی پر ظفر عباسی نے شادکوٹ کا ایک چکر اور لگایا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کے سپروائزر اور ان کے اسسٹنٹ بھی تھے۔ انہوں نے کافی دیر تک جگہ کا معائنہ کیا۔ ان کے تاثرات تسلی بخش تھے۔ وہ کسی خاص خدشے کا اظہار نہیں کرسکے۔ سابر کے گھر ہونے والی پُرتکلف دعوت کے دوران میں سپروائزر نے سابر کو مخاطب کرکے بس اتنا کہا۔ ''اگر آپ لوگ اس معاملے کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں تو کوئی ایسا انتظام کرلیں کہ چٹان کے نیچے کی مٹی آنے والے موسموں میں زیادہ ''سلائیڈ'' نہ کرے۔ مقامی لوگ مل کر وہاں پتھر وغیرہ بھر دیں۔''

...... پتا نہیں کیوں، نہ چاہنے کے باوجود سابر اس معاملے کو ''اہمیت'' دے رہا تھا...... کسی اور نے تو شاید

سپروائزر صاحب کی بات پر زیادہ غور نہیں کیا، لیکن سابر نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ وہ یہ حفاظتی اقدام ضرور کرے گا۔

اگلے تین چار ماہ میں سابر نے اس کام کو خصوصی اہمیت دی، بستی کے سیکڑوں لوگوں نے وقتاً فوقتاً رضاکارانہ طور پر کام کیا اور چھجے کے نیچے نمودار ہونے والے خلا کو پتھروں اور مٹی سے بھر دیا۔

زمین کے خلا بھر جاتے ہیں لیکن دل کے اندر وسوسوں کی صورت میں جو خلا پیدا ہوجائیں وہ آسانی سے نہیں بھرتے۔ سابر کے دل میں بھی ایسا ہی ایک خلا تھا جو چپکے چپکے وسیع ہورہا تھا۔ آرام اور راحت کی گھڑیوں میں یہ خلا اور بھی شدت سے محسوس ہوتا۔ شادکوٹ کی بستی اس کی محبوبہ تھی۔ وہ اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اسے تو یہ بھی گوارا نہیں ہوتا تھا کہ شادکوٹ کا کوئی باشندہ بستی چھوڑ کر چلا جائے یا شادکوٹ کا کوئی خوبصورت پیڑ کاٹ دیا جائے، بلکہ اسے تو یہ بات بھی شاق گزرتی تھی کہ شادکوٹ کے کسی گھر یا گلی محلے کی شکل خواہ مخواہ تبدیل کردی جائے۔ وہ اپنی محبوب بستی کو بالکل ویسے ہی دیکھنا چاہتا تھا جیسی وہ اس کے بچپن کے زمانے میں تھی۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک، اس بستی کے حوالے سے اس کی جو جو بھی یادیں تھیں وہ اسے جان سے پیاری تھیں۔ لیکن اب نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جب بھی بستی کو دیکھتا تو اس کی نگاہ اوپر...... بلندی پر سیاہی مائل چھجے کی طرف چلی جاتی تھی۔ نامعلوم بوڑھے کے الفاظ اس کے کانوں کو برقیلی بھنوروں کی طرح چھیدنے لگتے تھے۔ اس نے کہا تھا...... یہ پتھر گرے گا اور بستی کھنڈر ہوجائے گی۔ اس بستی کا کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ بوڑھے نے کہا تھا کہ وہ اس کے والد مرحوم کا دوست ہے مگر یہ بات بھی...... وضاحت سے ثابت نہیں ہوسکی تھی۔ بستی کے بڑوں سے پوچھتا پھرنے پر سابر کو بس اتنا ہی پتا چلا تھا کہ یہ عمر رسیدہ شخص، اکیلا یا اپنے کسی مرید کے ساتھ دو چار بار بستی میں آیا تھا...... اور اس کے والد مرحوم سے ملا تھا۔

اس شخص کی پیش گوئی کو اب قریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس ڈیڑھ سال میں وہ سابر کو دوبارہ دکھائی نہیں دیا تھا نہ ہی اس کی کوئی اطلاع ملی تھی...... اس شخص کا تصور جب بھی سابر کے ذہن میں آتا وہ اندر سے لاوے کی طرح کھول جاتا۔ اسے اب اس کے تصور سے چڑ ہوچکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان الفاظ سے بھی جو اکثر اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔

پھر ایک دن بیٹھے بٹھائے سابر نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ ایک ایسا فیصلہ جس نے اس کے رگ و پے میں ایک عجیب سی خوشی اور طمانیت بھر دی۔ اس فیصلے سے پیدا ہونے والی توانائی اتنی زیادہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے قراری سے اپنے کمرے کے دبیز قالین پر ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا، وہ اپنی بستی کو کیوں نہ ہمیشہ کے لیے اس چھجے کے خطرے سے آزاد کردے۔ کیوں نہ ایک ایسا قدم اٹھائے جس کے بعد اس بداندیش بوڑھے کی پیش گوئی پوری ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ یہ بستی اور یہاں کے لوگ اس پیش گوئی کی نحوست سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائیں۔

اگلے روز سابر نے بستی کے ''ملک'' کی حیثیت سے بڑوں کی ایک پنچایت بلائی اور ان کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ جو بات سابر کہہ رہا تھا اس پر عمل کرنا مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ ابتدا میں یہ بات سننے والے کو عجیب ضرور لگتی تھی مگر جب اس پر غور کیا جاتا اور اس کے دور رس فوائد دیکھے جاتے تو ذہن اس کو تسلیم کرنے لگتا تھا۔

سابر کا کہنا تھا کہ کیوں نہ چھجے کے خطرے سے ہمیشہ سے بچنے کے لیے بستی کو جوڑا پانی کی دوسری جھیل کے کنارے منتقل کردیا جائے۔ یہ دوسری جھیل پہلی جھیل سے قریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی اور ایسے رخ پر تھی کہ اس کے قرب و جوار کو چھجے کی چٹان سے کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ان دونوں بارشی جھیلوں کا پھیلاؤ اور گردوپیش تقریباً ایک ہی جیسا تھا۔ دونوں جھیلوں میں قریباً ایک جیسی بلندی سے ایک ایک آبشار گرتا تھا۔ دونوں کے جنوب میں ایک ہی جیسی سرسبز ڈھلوان موجود تھی۔

بستیاں بستے بستے بستی ہیں۔ ان کو اپنی مرضی کے ساتھ نئے سرے سے آباد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن یہ ناممکن بھی نہیں ہوتا اور شادکوٹ تو کوئی بہت بڑی بستی نہیں تھی۔ چند ہفتے تک بستی کے لوگوں میں اس معاملے پر بحث مباحثہ ہوتا رہا، آخر ایک مشترکہ رائے تشکیل پائی۔ بستی کو نئی جگہ آباد کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

☆☆☆

سابر نے بستی کو منتقل کرنے کے کام پر بھرپور توجہ دی اور اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کردیں۔ وقتاً فوقتاً اپنے دوست ظفر عباسی کا تعاون بھی اسے حاصل رہا۔ یہ کام بڑے منظم طریقے سے کیا گیا تھا۔ بستی کو سات آٹھ حصوں میں تقسیم کرلیا گیا۔ یہ ایک طرح سے سات آٹھ گلیاں تھیں۔ پہلے ایک گلی کے پچیس تیس گھروں کو متبادل رہائش فراہم کی گئی اور ان کے مکانات مسمار کردیے گئے لیکن انہیں اس طرح مسمار

کیا گیا کہ ان کا زیادہ تر ملبہ دوبارہ استعمال میں لایا جاسکے۔ خاص طور سے پتھر اور شہتیر وغیرہ۔ مسمار ہونے والی گلی کو نئی بستی میں بھی وہی لوکیشن اور وہی اسٹائل دیا گیا جو پہلی بستی میں تھا۔ تاہم لوگوں نے اپنی نئی ضروریات کے مطابق گھروں میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔

چار پانچ ماہ کے اندر جب یہ مکانات تیار ہوگئے تو مکینوں کو وہاں منتقل کردیا گیا اور دوسری گلی کی ڈیمولیشن اور تعمیر کا کام شروع کردیا گیا۔ اس تعمیر کے کام میں سنابر بڑے خاص الخاص رویے کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ نئی بستی میں پرانی بستی کا سارا رنگ ڈھنگ موجود ہو۔ مختلف گلیوں کی جھیل سے نزدیکی اور دوری کا تناسب وہی ہو، ویسے ہی موڑ ہوں، ویسے ہی چوراہے، ویسے ہی نشیب و فراز...... کبھی کبھی وہ اس معاملے میں بالکل سنکی سا لگنے لگتا تھا۔

بہار کی ایک خوشبودار شب میں جب وہ دن بھر کا تھکا ہارا، تاجور کے قرب میں سکون تلاش کررہا تھا...... تاجور نے اس کی بانہوں میں...... سماتے ہوئے پوچھا۔ ”سنابر جی! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم زمیندار نہیں ہو بلکہ تصویریں بنانے والے ہو۔“

”کیا مطلب؟“ سنابر نے اس کے راحت بخش گداز کو کچھ اور بھی اپنے اندر سموتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ کسی وقت لگتا ہے کہ تم بستی کو دوسری جگہ نہیں بسا رہے بلکہ ایک تصویر کو مٹا کر اس جیسی دوسری تصویر بنا رہے ہو۔ اس کوشش میں ہو کہ دونوں تصویروں میں تھوڑا سا فرق بھی نہ ہو۔“

”کیوں یہ بات تمہارے دماغ میں کیوں آئی؟“ سنابر نے اس کی خوبصورت ناک پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

”کل میری سہیلی سنبل کا گھر والا بتا رہا تھا کہ تم نے نئی بستی کے بڑے چوراہے سے تین درخت اس لیے کٹوا دیے ہیں کہ اس پرانی بستی کے چوراہے میں بھی یہ درخت نہیں ہیں۔“

”تو اس سے کیا ہوا۔ پانچ چھ گھروں کو نئے شہتیر بھی مل گئے اور چوراہا بھی یہاں کے چوراہے جیسا ہوگیا۔“

”سنابر جی! تم واقعی سنکی ہو۔“ تاجور نے سنابر کے گال پر جوابی چٹکی کاٹی۔ سنابر نے تاجور کو شریر نگاہوں سے دیکھا۔ دونوں کے پیار کی بلند لہروں میں اتھل پتھل ہونے لگی۔ چند لمحے بعد سنابر، تاجور سے علیحدہ ہوا۔ اس نے اپنا سر تکیے پر تھوڑا سا پیچھے کھسکایا اور لالٹین کی روشنی میں تاجور کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں دو معاملوں میں ہی تو سنکی ہوں۔ ایک تم اور دوسرا شادکوٹ۔ میں تم دونوں سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں تم دونوں جیسے ہو، ایسے ہی ہمیشہ میرے سامنے رہو۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“ وہ بھولے سے ہنسی۔ ”میں تو بوڑھی ہوجاؤں گی ایک دن۔“

”اس وقت میں بھی بوڑھا ہوجاؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”خیر یہ بعد کی باتیں ہیں...... ابھی کیا خیال ہے۔“ اس کا انداز معنی خیز تھا۔

وہ دلکش انداز میں شرمائی اور شرما کر اس کی بانہوں میں سما گئی۔

☆☆☆

دو سال کے عرصے میں شادکوٹ کی پوری بستی ”جوڑا پالی“ کی دوسری جھیل پر منتقل ہوگئی۔ دور سے دیکھنے پر ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی مافوق الفطرت طاقت نے شادکوٹ کی بستی کو اٹھا کر ایک جھیل سے دوسری جھیل کے کنارے منتقل کردیا ہے۔ مسجد کی جگہ مسجد، چوراہے کی جگہ چوراہے، دکانوں کی جگہ دکانیں، غرض سب کا سب ویسے ہی نظر آتا تھا۔ گھروں کی ساخت میں بھی بہت تھوڑی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ جاگتی آنکھوں کا ایک خواب سچ ثابت ہوگیا تھا۔ بستی، مہلک شکنجے سے نکل آئی تھی۔

جس دن بستی کا آخری مکین بھی نئی بستی میں منتقل ہوگیا، شام کے بعد سنابر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھا اور اس نے دور افتادہ شکنجے کو دیکھا، وہ ہمیشہ کی طرح بے حرکت تھا۔ لیکن اب اس کی حرکت یا بے حرکتی سے شادکوٹ کو کچھ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

سنابر نے سوچا...... بے شک آفات اور حوادث سے تو کوئی بستی کبھی بھی محفوظ نہیں ہوتی، لیکن آج اس نے شادکوٹ کو کم از کم اس سیاہ چٹان والی آفت سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس بوڑھے کی یہ پیش گوئی بھی ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی تھی کہ ایک روز اس چٹان اور بستی کا ”ملاپ“ ہوگا اور سنابر اپنی اس بستی کو کھنڈر کے روپ میں دیکھے گا۔ ہاں...... آج اس نے کم از کم یہ منحوس پیش گوئی ہمیشہ کے لیے باطل کردی تھی۔ اسے عجیب سے اطمینان اور فخر کا احساس ہوا۔

پانچ چھ روز بعد سنابر نے بستی میں ایک رنگا رنگ جشن کا اہتمام بھی کیا۔ یہ جشن، دراصل اس فتح کی خوشی میں تھا جو سنابر نے ایک پُرخطر پیش گوئی کے اوپر حاصل کی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ اسی طرح چھ سات ماہ گزر گئے۔ سنابر ہر طرح سے خوش اور مطمئن تھا۔ کون سی آسائش تھی جو اسے حاصل نہیں تھی اور اس کی کون سی خواہش تھی جو پوری نہیں ہوئی تھی...... ہاں بس ایک خواہش تھی۔ اس کی شادی کو قریباً چار سال بیت گئے تھے مگر ابھی تک اس کے گھر میں بچے کی چہکار نہیں گونجی تھی، اور پھر ایک روز اوپر والے نے یہ خواہش بھی پوری کردی۔ مردانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک پُرتکلف کھانا کھانے کے بعد وہ شب بسری کے لیے اپنے نیم گرم کمرے میں داخل ہوا تو تاجور نے اسے عقب سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ اب اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح عقب میں کھڑے کھڑے تاجور نے اسے شرمیلے لہجے میں وہ خوش خبری سنادی جسے سننے کے لیے اس کے کان مدت سے ترس رہے تھے۔

اس کی خوش بختیوں میں ایک اور خوش بختی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ ہر گھڑی تاجور کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اس کے کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کی نگرانی کرنے لگا۔ وہ نومبر کی ایک ٹھنڈی سہ پہر تھی۔ سنابر اپنے حویلی نما گھر میں داخل ہوا تو تاجور شال لے کر کہیں نکل رہی تھی۔

اس کی سہیلیاں لالہ اور سنبل وغیرہ بھی ساتھ تھیں۔

”کہاں جارہی ہو؟“ سنابر نے اسے کمرے میں بلاتے ہوئے پوچھا۔

”بس ذرا ترائی تک۔“ اس نے کہا۔ ترائی اس ڈھلوان کو کہا جاتا تھا جہاں خودرو پھول اور پودینے کی پتیاں کثرت سے ملتی تھیں۔ بستی کی عورتیں اکثر اس طرف جاتی رہتی تھیں۔ یہ جگہ پرانی بستی کے بالکل ساتھ تھی۔

”تمہیں کئی دفعہ کہا ہے اس حالت میں زیادہ گھوما پھرا نہ کرو۔ کہیں پاؤں رپٹ جائے، یا ویسے ہی جھٹکا وغیرہ لگ جائے۔“

اوہو، پاؤں تو کہیں بھی رپٹ سکتا ہے سنابر جی۔ حادثے تو ہر وقت ہمارے اردگرد موجود رہتے ہیں۔“

”پر ان سے بچنے کی اپنی سی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔ تم ان دنوں باہر نہ نکلا کرو تو کیا ہوجائے گا۔“

”اچھا بابا، نہیں نکلوں گی لیکن اب تو جانے دو۔“ وہ بچکانہ انداز میں بولی۔

جب وہ ایسے بولتی تھی تو وہ خاموش ہونے پر مجبور ہوجاتا تھا۔

اور وہ چلی گئی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود چلی گئی۔ جب حادثے اپنی طرف بلاتے ہیں تو ایسے ہی ہوا کرتا ہے۔ ایک خاص وقت میں، ایک خاص لمحے میں، ایک مقرر مقام پر انسان کو اور ”حادثے“ کو ملنا ہوتا ہے۔

ہاں وہ چلی گئی۔ ترائی پر سے پودینے کی تازہ پتیاں توڑنے کے لیے۔ شاید اس کے ذہن میں پودینے کی چٹنی کی خواہش تھی۔ آج کل وہ ایسی کھٹی میٹھی چیزیں شوق سے کھانے لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سنابر اپنی والدہ کے پاس آن بیٹھا۔ انہیں اپنی عمدہ فصل کی بابت بتانے لگا۔ اتنے میں تیز ہوا چلنے لگی تھی اور آسمان پر سیاہ بادل گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک سنابر کو محسوس ہوا کہ زمین ہل رہی ہے۔ ماں بیٹے نے ڈری ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر کمرے میں سے نکل کر کھلے صحن میں آگئے تو زیادہ شدید جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ اردگرد کے گھروں سے چلانے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ یہ ایک درمیانے درجے کا زلزلہ تھا۔ لیکن اس زلزلے کے ساتھ جو گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی وہ بہت خوفناک تھی۔ یوں لگا جیسے ایک ساتھ کئی زوردار دھماکے ہوئے ہوں۔ فضا میں ہولناک گونج اور زمین میں عجیب طرح کا ارتعاش پیدا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی سنابر نے دیکھا کہ شمال کی طرف سے گردوغبار کا ایک بادل بلند ہوا ہے۔

”یاخدا!“ سنابر کا دل بے پناہ شدت سے دھڑکا۔

وہ جیسے ہوا میں اڑتا ہوا باہر آیا۔ اس نے بائیں جانب دیکھا گردوغبار کا بادل کئی سوفٹ اوپر چلا گیا تھا...... وہ دائیں طرف دیکھنے سے پہلے ہی جان گیا کہ ہمیشہ ساکت و جامد نظر آنے والا ”چچا“ آج اپنی جگہ موجود نہیں رہا ہے۔ ہاں، وہ موجود نہیں تھا۔

وہ چلاتا ہوا دیوانہ وار گردوغبار کے بادل کی طرف بھاگا۔ اس کے آگے پیچھے بھی بہت سے لوگ بھاگ رہے تھے۔ سب کا رخ گردوغبار کے مہیب بادل کی طرف تھا۔ وہ اپنے سینے کی پوری طاقت سے اپنی تاجور کو پکار رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں، اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی تاج کو زندہ دیکھ سکے گا۔

☆☆☆

مہیب چٹان کا لڑھک جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ گرنے کے بعد چٹان کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ رات تک علاقے کے ہزاروں لوگ جائے حادثہ کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ بستی کی چار عورتیں اور دو کھیت مزدور اس حادثے کی زد میں آئے تھے۔ جانوروں کا نقصان اس کے علاوہ تھا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے تین لاشیں نکال لی گئیں۔ تین افراد ابھی تک ملبے کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ ان میں تاجور بھی شامل تھی۔ سنابر کے روتے بلکتے سینے میں اُمید کے چراغ جلتے بجھتے رہے۔ یہاں تک کہ تاجور کو بھی پتھروں کے نیچے سے نکال لیا

گیا...... وہ مر چکی تھی۔

تاجور کی لاش نکل آئی تو ستابر کے لیے چہار سو تاریک زہریلا دھواں سا پھیل گیا۔ اس گھٹا ٹوپ دھوئیں میں، اسے سانس لینا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ اردگرد کا ہر منظر اس کی نگاہوں میں دھندلانے لگا تھا۔ گیس لیمپس کی روشنی میں وہ تاجور کو چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کا جسم بری طرح کچلا مسلا گیا تھا۔ بس چہرہ ہی سلامت رہا تھا۔ تاجور کے ساتھ ہی اس کے اندر دھڑکنے والی زندگی بھی اپنے تمام تر خوبصورت امکانات سمیت موت کی وادی میں اتر گئی تھی۔

تاجور اور دیگر لاشوں کی تدفین کے مناظر...... ستابر کو بس دھندلے دھندلے یاد تھے۔ وہ جیسے ان مناظر کے درمیان نہیں تھا، وہ کہیں اور...... بہت دور تھا۔ اس کے گرد بس سیاہی تھی اور ناقابل فہم ماتمی آوازیں تھیں۔

تاجور کو رم جھم برستی بارش میں، سپردخاک کرنے کے بعد جب وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا واپس بستی میں پہنچا تو اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ شاید زندگی بھر کے آنسو وہ گزشتہ ایک رات میں ہی ختم کر چکا تھا۔ اب بس...... اس کا کمزور دل ایک خشک پتے کی طرح لرزتا جا رہا تھا۔

وہ تین دن تک اپنے گھر سے نہیں نکلا اور نہ ہی کسی سے ملا۔ وہ عجیب نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھا۔ چوتھے روز وہ سہ پہر کے وقت گھر سے باہر آیا تو اپنے شادکوٹ کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ زلزلے نے بستی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچایا تھا پھر بھی اسے یہ صحیح سلامت بستی بالکل کھنڈر نظر آ رہی تھی۔ اسے لگا، گلیوں میں اداسیوں کے زرد سائے رینگ رہے ہیں، پیڑوں تلے خشک پتے چرمرا رہے ہیں اور گھر کے آنگنوں میں گرد آلود جالے لٹک رہے ہیں۔ یہاں کچھ بھی تو درست نہیں تھا۔ ہر خوبصورتی، بدصورتی اور ہر رونق، ویرانی میں بدل چکی تھی۔ یہ برباد بستی تو اس کی بستی ہی نہیں تھی۔ وہ آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھتا رہا، مگر زرد اداس دھند میں لپٹے ہوئے منظر نہیں بدلے۔ سفید ریش بوڑھے کے گم گشتہ الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ وہ ہر ایک لفظ علیحدہ علیحدہ سن سکتا تھا۔ ''...... جو پتھر ایک مدت سے تمہاری بستی کے اوپر ٹھہرا ہوا ہے، وہ اب زیادہ دیر ٹھہرنے والا نہیں ہے۔ یہ بہت جلد گرے گا اور تم اپنی بستی کو کھنڈر دیکھو گے۔ یہاں کچھ بھی نہیں بچے گا تمہارے لیے۔''

آج کئی برس بعد...... ستابر کی تمام تر کوشش کے باوجود یہ الفاظ درست ثابت ہو رہے تھے۔ پتھر گرا تھا۔ اگرچہ وہ بستی پر نہیں گرا تھا، لیکن بستی پھر بھی برباد ہو گئی تھی اور یہ بستی اس کے دل کی بستی تھی۔ اب تاجور کے بغیر شادکوٹ اس کے لیے ایک خرابے کے سوا اور کچھ نہیں رہا تھا۔ ایک مدت بعد آج ستابر کو پتا چل رہا تھا کہ شادکوٹ کی ساری دلکشی تو دراصل تاجور کی دلکشی تھی۔ سفید ریش بوڑھے کی پیش گوئی اس انداز میں درست ثابت ہوئی، ستابر نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب اس خرابے میں ستابر کے لیے دم گھونٹ دینے والی اداسیوں کے سوا اور کچھ نہیں بچا تھا۔ لہٰذا وہ وہاں سے نکل آیا...... وہ چلتا، اور بس چلتا گیا۔ اجاڑوں میں جنگلوں میں اور ویران پہاڑوں میں۔ کسی نے اس سے کہا تھا، یہ ویران پہاڑ، یہ اجاڑ خاک ہیں، یہ جنگل بیلے، یہ سب بندے کو اپنی پہچان کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ بندے کو خلقت سے دور اور خالق سے قریب لاتے ہیں۔

ہاں، وہ نکل گیا تھا اور اب وہ دو سال کے لیے نہیں نکلا تھا، ہمیشہ کے لیے نکل آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب اسے بھٹکتے ہوئے دو سال گزرے تو اسے لگا جیسے ابھی چند روز ہی گزرے ہوں۔ حالانکہ کسی وقت یہی دو سال اسے دو صدیوں کے برابر لگے تھے اور اب تو کئی بار ''دو سال'' گزر چکے تھے۔ اسے ویرانوں میں بادیہ پیمائی کرتے ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ اسے اب خبر ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کس کس علاقے میں کتنے کتنے عرصے تک بھٹکتا رہا ہے اور اب قریباً پچیس برس بعد اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ایک بار...... صرف ایک بار اپنی محبوب بستی کو دوبارہ دیکھے۔

وہ تذبذب کے عالم میں ڈیڑھ دو ماہ تک کوہ قراقرم کے نشیب و فراز میں چلنے کے بعد آخر اس دوراہے پر پہنچا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

ہموار پتھر پر بیٹھے بیٹھے ستابر نے اپنی سفید بھوؤں کے نیچے بوڑھی آنکھوں کو سکوڑا اور ایک بار پھر دوراہے پر لگا ہوا آہنی بورڈ پڑھنے کی کوشش کی۔ بورڈ کے الفاظ ایک بار پھر آپس میں گڈمڈ تھے۔ ''شادکوٹ کا راستہ...... شادکوٹ کا کھنڈر...... راستہ...... کھنڈر...... راستہ...... کھنڈر''

ہاں وہ شادکوٹ کا کھنڈر...... ہی تھا کیونکہ وہاں اب تاجور نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اسے تاجور کے ساتھ ساتھ شادکوٹ سے بھی کبھی نہیں ملنا ہے۔ ان دونوں کو صرف اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھنا ہے۔ وہ اپنے خستہ، کمزور جسم کو لاٹھی کا سہارا دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شام ہو رہی تھی، سردی بڑھتی جا رہی تھی، پرندے اور راہگیر گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ وہ پھر کسی ویرانے کی جانب چل دیا تھا......

☺